ڈاکٹر نازیہ ملک

استاد شعبہ اُردو ،

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد۔

اردو فکشن میں عصری آگہی کی روایت

Dr. Nazia Malik

Assistant Professor, Urdu Department,

National University of Modern Languages, Islamabad.

Urdu Fiction, Effect of Social Life on Literature, Representation of real life

Tradition of Contemporary Awareness in Urdu Fiction

Literature is closely associated with its contemporary political and social scenario, writers conceive their ideas directly from the environment they live in, so literary work reflects the awareness of the writer towards current issues, so this article discusses the Urdu fiction in its contemporary social and political scenario. This article represents a survey of Urdu Literature keeping in view the contemporary issues.

ادب اور عصر کا تعلق:

ادب اور عصر کے تعلق سے انکار ممکن نہیں۔ ادب دراصل اپنے عہد کے ظاہر و باطن کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور جو کچھ اس عہد کے باطن میں وقوع پذیر ہو رہا ہوتا ہے۔ ادیب کی تحریریں ان سب کا احاطہ کر رہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ادب زندگی اور معاشرے کا ایک حساس ترجمان ہے جو اس کے مد و جزر اور طوفان کو احساسات، جذبات اور حسیت کے ساتھ دلوں سے دلوں تک پہنچاتا ہے۔ اس لیے ادب براہ راست ہماری سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی سے متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے افعال و اعمال۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر یا ادیب جو کچھ تخلیق کرتا ہے اس میں اس کی داخلی کیفیت اور اندرونی کسک، خلش اور کش مکش کو بڑا دخل ہوتا ہے لیکن یہ داخلی کیفیت درحقیقت تمام خارجی اسباب و حالات کا نتیجہ

ہوتی ہے جس میں وہ رہتا ہے۔اس لیے کسی عہد کی تاریخ کو جانچنے کے لیے اس عہد کے ادب کا مطالعہ انتہائی ناگزیر ہے۔حالات وواقعات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب بھی ترقی کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ادب کی بنیاد میں بہت سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں، سیاسی، سماجی اور معاشی حقائق سب مل کر ادب کی بنیاد بنتے ہیں۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان سیاسی، سماجی اور معاشی حقائق کا اردو ادب سے تعلق بہت گہرا اور مضبوط ہے اور اردو ادب کے موضوعات بھی انہی حقائق کے تناظر میں جنم لیتے ہیں۔ڈاکٹر نذیر تبسم اس حوالے سے کہتے ہیں کہ

> 'بنیادی طور پر ادب ہی وہ آئینہ ہے جو کسی زمانے کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی اقدار اور روایات کے تناظر میں منعکس کرتا ہے اور مجموعی رویوں کا احساس دلا کر ثقافت عصر کے خدوخال بھی نمایاں کرتا ہے''۔[1]

ادب اور عصری آگہی:

''عصر'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی روزگار، زمانہ اور وقت کے ہیں۔اور آگہی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی خبر، علم، واقفیت، جاننا وغیرہ کے ہیں۔عصر انگریزی لفظ Contemporary سے ماخوذ ہے اور آگہی Awarness کا متبادل ہے۔

عصری آگہی کا مطلب اپنے عہد کے بارے میں جاننا، اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور معاشی منظرنامے کا شعور رکھنا اور مسلسل وقوع پذیر ہوتی تبدیلیوں سے آگاہ رہنا ہے۔ہر عصر میں تغیر وتبدل ہمہ وقت جاری وساری رہتا ہے اور زندگی کے نئے رخ متعین کرتا ہے۔ہر نیا عہد انسانی زندگی کو مختلف طرح متاثر کرتا ہے جوں جوں عصری سطح پر تبدیلی رونما ہوتی ہے۔انسانی زندگی اور اس سے متعلق تمام شعبۂ ہائے زندگی بھی متاثر ہوتے جاتے ہیں اور اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔بقول انور سدید:

> عصری آگہی سے مراد کسی مخصوص عہد میں معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات، افکار، اذکار اور انکشافات سے آگہی ہے۔[2]

عصری آگہی جہاں معاشرے کے عام افراد کے لیے اہم ہے وہاں اعلیٰ علمی وادبی شخصیات کے لیے اس کی حیثیت مثل روح کی ہے۔عصری آگہی ادب کی سمت متعین کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے عہد سے جوڑنے، زندگی کے موجودہ مسائل، معیارات اور حقائق پر نظر رکھنے اور تازہ فکری رویوں سے ہم آہنگ کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔عصری آگہی روایت سے انحراف کا درس نہیں دیتی بلکہ یہ روایت کے تازہ اور زندہ عناصر کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

ادب کا تعلق کسی خاص فکر وفلسفے سے ہی نہیں بلکہ ہر فکر وفلسفے سے ہے کیونکہ ہر وہ چیز جو انسان اور انسانی معاشرے سے متعلق ہوگی وہ ادب کا حصہ بنے گی۔چنانچہ سیاسی شعور، سماجی ومعاشی حالات وواقعات براہ راست ادب نہ ہوتے

ہوئے بھی ادب کا حصہ ہوتے ہیں اور ادب نے ہر دور میں مختلف اصناف کے ذریعے ان حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے۔عصری آگہی کا سب سے بڑا وسیلہ ادب ہے۔ادب ہر دور میں اپنے معاشرے کے سیاسی، سماجی و معاشی حقائق کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ادب معاشرے کے داخلی و خارجی تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے اور ان کی گہرائی میں اتر کر تمام حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ادب ایک نسل کے تجربات و مشاہدات کو اگلی نسل تک پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یعنی ادب اپنے عصر کی زبان بن کر اس کی ترجمانی کا حق ادا کرتا ہے۔

> عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔اپنے زمانے اور اس کے شعور ہی سے تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے لیکن یہ روح صرف زندگی کی یک رخی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اس میں لاتعداد رخوں کو سمیٹ کر اسے کچھ اور بنا دیتی ہے اور اسی لیے ادب کی آواز ایک طرف اپنے دور کی اور دوسری طرف آنے والے دور کی آواز بن جاتی ہے۔ادب اور زندگی کا یہی رشتہ ہے جو واقعات سے نہیں بلکہ روح سے قائم ہوتا ہے۔[۳]

ڈاکٹر سلیم اختر ادب اور عصری آگہی کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میرے لیے عصری آگہی کا سب سے بڑا ذریعہ ادب ہے۔خواہ وہ نثر میں ہو یا شعر میں۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اصل بات یہ ہے کہ لفظ ایک نسل کے تجربہ کو دوسری نسل تک منتقل کرنے کا پُل بنتا ہے۔[۴]

الفاظ کو ایک نسل سے دوسری تک پہنچانے کا ذریعہ ادیب ہوتا ہے۔ادیب کی نظر معاشرے کے مسائل کی داخلی اور خارجی دونوں سطح تک ہوتی ہے وہ ایسے پہلوؤں کا اظہار بھی کرتا ہے جو عام فرد کی نگاہوں سے چھپے ہوتے ہیں۔بقول شہزاد منظر:

> ادیب معاشرے کا انتہائی حساس فرد ہونے کی وجہ سے اپنے دور کے سماجی امور کے بارے میں دوسروں سے زیادہ ادراک رکھتا ہے اور اپنے دور کے بارے میں سوچتا اور محسوس کرتا ہے اس لیے ہر دور اور معاشرے میں ادیب ایک ذمہ دار اور محبِّ وطن شہری کی حیثیت سے اپنے دور کے سماجی اور سیاسی معاملات کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ اور مؤقف رکھتا ہے۔[۵]

گویا ادیب اپنے عہد کا ایک مصور ہوتا ہے اور اس کی تحریریں ایک مکمل عہد کا احاطہ کرتی ہیں۔وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے ایک عہد کے سیاسی و سماجی نظریات، علم و دانش اور اندازِ فکر کو دوسرے عہد تک پہنچانے کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا ادیب اور اس کے روحِ عصر سے تعلق کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ادیب محض اپنے عصری جوار بھاٹے ہی سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے عصر کی روح، اس کے جوہر سے بھی متعارف ہوتا ہے۔ مقدم الذکر سطح پر وہ تجربے اور مشاہدے کے مراحل سے گزرتا ہے اور مؤخر الذکر سطح پر اپنے تخلیقی عمل کی مدد سے انکشاف و عرفان کے مراحل سے آشنا ہوتا ہے۔ مگر دونوں سطحیں الگ الگ نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں۔ وہ یوں کہ ادیب جب اپنے عصر کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے اندر کی تخلیقی مشین متحرک ہو کر اسے روح عصر سے ہم رشتہ کر دیتی ہے، پھر جب وہ ادب تخلیق کرتا ہے تو اس میں صرف ان دونوں کا امتزاج نہیں ہوتا بلکہ تخلیق کار کی اپنی ذہانت کی آمیزش سے ایک ایسی شے خلق ہو جاتی ہے جو بے مثال بھی ہوتی ہے اور لازوال بھی۔ [۶]

اسی طرح فضیل جعفری کے مطابق:

جو لوگ عصری مسائل کو روحانی اور جمالیاتی تجربے میں بدل دینے پر قادر ہوتے ہیں ان کے یہاں حقیقی عصریت کا عنصر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ۷

ادیب اور عصری ادب کے تعلق کے حوالے سے انور سدید کا کہنا ہے کہ:

ادیب اپنے عہد کا جزو لاینفک ہوتا ہے اور وہ اپنے عصر سے جدا نہیں ہو سکتا۔ ادیب جب اظہارِ ذات کے لیے ادب کو وسیلہ بناتا ہے تو اس کی تخلیق میں وہ لرزشیں بھی شامل ہوتی ہیں جو اس عہد کی معاشرتی، تہذیبی اور فکری سطح پر رونما ہو رہی ہوتی ہیں اور جن سے ادیب کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتا ہے۔ حال وہ لرزیدہ لمحہ ہے جن کی زد پر ادیب ہمیشہ رہتا، حوادث زمانہ کے وار سہتا، تجربات سمیٹتا اور مستقبل کی طرف بڑھتا ہے۔ ماضی وہ جھولی ہے جس میں یہ تجربات کسی محفوظ خزینے کی صورت جمع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ادیب ان دونوں زمانوں کے تجربات کو نہ صرف اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بناتا ہے بلکہ اس تجربے کو تخلیقات کی صورت دے کر آئندہ نسلوں کے لیے بصیرت اور آگہی کا سامان بھی فراہم کر دیتا ہے۔ چنانچہ تخلیق وہ بدن ہے جس میں عصری آگہی حرکت و حرارت پیدا کرنے کے لیے زندگی کی روح پھونکتی ہے۔ ۸

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ادیب کی عصری آگہی عام شہری کی عصری آگہی سے مختلف ہوتی ہے۔ عام شہری تو وقتی ضرورت یا مادی ضرورتوں کے تحت عصر سے آگہی رکھتا ہے مگر ادیب اس کے برعکس عصری آگہی کو تاریخ کا حصہ بناتا ہے اور آنے والے وقتوں کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔

اردو فکشن میں عصری آگہی کی روایت:

جہاں تک عام معنوں میں عصری آگہی کا تعلق ہے تو عصری آگہی آغاز سے ہی اردو ادب کا حصہ رہی ہے۔ خواہ وہ شاعری ہو یا نثر۔ داستانیں، طویل مثنویاں، مرثیہ، رباعی، قصیدہ، غزل اور عشق و محبوب، حسن و جمال سے بھرپور شاعری

آغاز ہی سے اپنے عہد کا نمایاں اثاثہ رہی ہیں۔ اردو شاعری کی روایت کے فروغ میں میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ کے نام لیے جا سکتے ہیں ان شعرا نے اپنے عہد کی سماجی و عصری زندگی کے حالات اور ان گنت مسائل کو شاعری کا حصہ بنایا۔ اگر ہم اپنے ہاں ادب میں عصری آگہی کی روایت کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف حالات کے پیش نظر عصری آگہی کی روایت ادب کے دھارے پر مسلسل ارتقا کرتی نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے ایک طرف عربی فارسی کے قصے ہمارے سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کو قصے کہانی کی شکل عطا کی۔ دوسری طرف یہ قصے کہانیاں عربی و فارسی سے جب اردو ادب میں داخل ہوتے ہیں تو ہم ان کے لیے داستان کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ قدیم داستانیں انسانی زندگی کی ابتدائی صورتحال کی عکاس ہیں۔ اور انسانی نفسیات اور معاشرتی زندگی کی آئینہ ہیں۔ داستانیں اپنے آغاز سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ارتقاء پذیر رہی ہیں۔ جن میں عصری آگہی آغاز سے آخر تک نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سہیل بخاری:

> دور قدیم کا انسان جس طرح سوچتا، عمل کرتا اور اپنے لیے زندگی کے نئے پہلو تلاش کرتا تھا یہ داستانیں اس کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔۹

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستانیں ہماری فکری، تہذیبی، سیاسی و سماجی اور معاشی زندگی کی ترجمان ہیں۔ ان میں ہمارا ماضی اپنے تمام تر رویوں کے ساتھ منعکس ہوتا ہے اور ہماری زندگی کے مختلف اور منفرد رویے پوری تازگی کے ساتھ موجود ہیں۔ جو ماضی کی بازیافت کو علمی و ادبی رویوں میں یوں منکشف کرتی ہیں کہ قدیم عہد کی زندگی کا تمام منظر نامہ سمٹ کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

اردو ادب میں داستان نویسی کا آغاز ملا وجہی کی ''سب رس'' (۱۶۳۵ء) سے ہوتا ہے۔ تصوف میں رنگیہوئی اس داستان میں انھوں نے کئی جگہوں پر اس عہد کے مزاج، اخلاقی اقدار، معاشرت اور رسم و رواج وغیرہ کو بیان کر کے اردو نثر میں عصری شعور کو رواج دیا۔ پھر بعد میں بے شمار داستانیں اردو ادب کی زینت بنیں۔ جس میں ''باغ و بہار''، آرائش محفل''، ''رانی کیتکی''، ''گل صنوبر''، ''سروش سخن''، ''طلسم حیرت''، ''داستان امیر حمزہ''، ''گلزار دانش''، ''توتا کہانی''، ''فسانہ عجائب'' وغیرہ شامل ہیں۔ آغاز میں ان داستانوں کو صرف تخیلی چیز سمجھا جاتا رہا جس کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں لیکن اگر ان داستانوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان داستانوں کا ماحول، کردار، واقعات اپنے عہد کے انسان کی محرومیوں، دکھوں، ناآسودہ خواہشوں اور خوابوں کا احوال سناتے ہیں۔ اور اپنے عہد سے آگہی کا پتا دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر فوزیہ اسلم:

> یہ داستان کی وہ دنیا ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تخیلی دنیا ہے، حقائق اور واقعیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ داستان انسان اور اس کے سماج کی عکاسی (Reflection) بھی ہے اور ردعمل (Reaction) بھی۔ اس تخیلی دنیا کا خمیر اس کی ان محرومیوں سے اٹھتا ہے جن کا علاج مجبور و مقہور دنیا کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ چنانچہ ان محرومیوں اور بے بسی سے نکلنے کے لیے وہ اس شہزادے کی تخلیق کرتا ہے جو اسے بالآخر آزاد

کرا دیتا ہے۔ چنانچہ جس طرح خوابوں کو انسان کی ادھوری زندگی کی تکمیل کا ایک لمحہ کہا جاتا ہے اسی طرح داستان جاگتے ہوئے خوابوں کی ایک صورت ہے۔۱۰

اردو ادب میں داستان نگاری کی ایک روایت فورٹ ولیم کالج سے بھی شروع ہوتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کا بنیادی مقصد تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب واختیار کے لیے تعلیمی مقاصد میں آسانی کے لیے نثر کو رواج دینا تھا مگر اس کالج کی نثر نے اردو ادب پر بھی بہت دور رس اثرات مرتب کیے۔ اس دور میں جو داستانیں ترجمہ ہوئیں ان میں باغ و بہار، آرائش محفل، توتا کہانی، داستان امیر حمزہ، قصہ گل بکاؤلی، شکنتلا، کام کنڈلا، مادھولال وغیرہ۔ ان تمام داستانوں میں ہمیں اس دور کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

ان داستانوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور شہرت ''باغ و بہار'' کو حاصل ہے۔ باغ و بہار میں اس دور کے معاشرتی مسائل اور معاشرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے کردار اپنے ماحول، فضا، عہد کی عمدہ نمائندگی کرتے ہیں جس سے وہ تمام عہد اور اس کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ اور اس داستان کو اسلوب کی سادگی اور سلاست کی وجہ سے اردو کے افسانوی ادب کا نقطۂ آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رجب علی بیگ سرور کی داستان ''فسانۂ عجائب'' جسے ایک حوالے سے اردو ادب کی آخری داستان کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس داستان میں ہمیں لکھنؤی عہد کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جس میں ہم اس عہد سے آگہی حاصل کر کے اسے اپنے سامنے جیتا جاگتا محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح اردو ادب کے نثری سرمائے میں فورٹ ولیم کالج کی نثر کی روایت، دہلی کالج کی علمی نثر، مرزا غالب کی شخصی و ادبی نثر نے عصری ادب کے لیے ایک راستہ فراہم کیا۔ جس پر آگے چل کر سرسید تحریک نے ادب کو عصر سے منسلک کر کے پیش کیا۔ اور ادب کا رشتہ آگے چل کر سماج اور سماجی مسائل سے جوڑ دیا گیا۔ اس طرح اردو ادب میں پہلی بار باقاعدہ طور پر مقصدی شعر و ادب کی روایت قائم ہوئی جس نے ادب اور عصری شعور کے تعلق کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ اور داستان کا رخ ناول نگاری کی طرف موڑ دیا جس میں زندگی کے حقائق کو موضوع بنایا گیا اور کہانی کو خیالی دنیا سے نکال کر اسے حقیقی مسائل کی طرف موڑ دیا گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اردو ادب میں ایک انقلابی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سانحے نے برصغیر میں سیاسی، سماجی و معاشی حوالے سے تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا ہے۔ جس سے اردو ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس صورتحال کی عکاسی علی عباس حسینی نے یوں کی:

> ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ یہ فوجی بغاوت میرٹھ سے شروع ہو کر چشم زدن میں جنگل کی آگ کی طرح یو پی، بہار اور دلی میں پھیل گئی۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ ہزاروں خاندان تباہ ہوئے۔ مغل بادشاہ کو رنگون بھیجا گیا، دلی اجڑ گئی، لکھنؤ برباد ہوا، اور کلکتہ آباد۔ کمپنی کی حکومت ختم اور ملکہ کی فرمانروائی شروع ہوئی۔۱۱

برطانوی حکومت نے مغلیہ سلطنت کو ختم کر کے مکمل طور پر ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور اس کے ظلم و ستم سے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی انتہا پر پہنچ گئی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف سلسلہ وار کارروائیوں کا

آغاز کر دیا۔ ہندوستانی عوام کو سر عام قتل کیا گیا۔ لوگوں، بچوں، عورتوں کو بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم ہوا جس نے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا۔ جس سے صدیوں کی حاکم قوم سیاسی اقتدار سے محروم ہو کر ہمیشہ کے لیے شکست خوردہ قوم بن گئی۔ انگریز مسلمانوں کی طرف سے بدگمان ہو چکے تھے اسی وجہ سے انھوں نے مسلمانوں پر ہر طرح کی اقتصادی و معاشی پابندیاں لگا دیں اور ہندوؤں نے جنگ آزادی کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ کر انگریزوں کی قربت حاصل کر لی جس سے وہ معاشی ذرائع پر قابض ہو گئے اور مسلمانوں کے حالات دن بدن خرب سے خراب ہوتے چلے گئے۔ بقول سید حسن ریاض:

> حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے بڑی ذہانت سے ہندوستان میں اپنے سیاسی تجربات استعمال کیے۔ مسلمانوں کو ان کی تہذیب، تمدن، علم اور سیاسی اقتدار کے بلند مقام سے گرا کر ان پر معاش کے تمام دروازے بند کر کے، حکومت کی تعزیر سے ڈرا کر اطاعت پر مجبور کیا تو ہندوؤں کو یہ یقین دلا کر برطانیہ کی طاقتور سنگینیوں کی حمایت میں ان کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا موقع ملے گا، اپنی وفاداری پر آمادہ کر لیا۔۱۲

دوسری طرف مسلمان جب سیاسی اقتدار سے محروم ہوئے تو ذہنی سکون کی خاطر خیالی دنیا میں کھو کر رہ گئے۔ بدلے ہوئے حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے اب انھیں نئے ہتھیاروں کی ضرورت تھی کیونکہ برصغیر کے حالات اب تیزی سے بدل رہے تھے۔ اب ہندستانی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرنا ضروری تھا کہ پرانا نظام زندگی اور فکر و عمل اب بدل چکا ہے اور آئندہ زندگی میں تحفظ اور بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذہنی قوت اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور آگے بڑھیں۔ اسی اثنا میں تحریک سرسید کا آغاز ہوا اس تحریک نے مفاہمتی رویہ اختیار کیا اور اس تحریک کے زیر اثر جو ادب سامنے آیا اس کا مقصد فرنگی حکومت اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنا اور آپس کی نفرت ختم کرنا تھا۔ جس کے لیے تحریک سرسید دن رات کوشاں تھی۔ وہ یوپی کے اشرافیہ کو انگریزی تعلیم دے کر فرنگیوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ جس طرح یہ مغلوں کے وفادار تھے اب یہ فرنگیوں کے وفادار ہوں گے۔ تحریک سرسید کا مقصد صرف اشرافیہ کی تعلیم و تربیت تک محدود تھا۔ اس تحریک نے تعلیمی، سیاسی، معاشرتی و اخلاقی اور معاشی پہلوؤں کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی اصلاح کا کام شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کو مقفیٰ و مسجع لب و لہجے اور جنوں پریوں کی کہانیوں سے نجات دلا کر اسے عصری مسائل اور نئے رجحانات سے روشناس کروا دیا۔

اس تحریک نے اپنے عہد میں اردو ادب پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ عوام کو داستانوں کی فرضی، خیالی اور غیر حقیقی دنیا سے نجات دلائی۔ کہانی کے سفر کو ایک نیا اور تاریخی موڑ فراہم کیا۔ اس طرح اردو نثر میں مزید نکھار آتا گیا اور وہ سنجیدہ مسائل اور موضوعات کو بیان کرنے کے قابل ہو گئی۔ سرسید تحریک جن علوم و فنون کو سامنے لے کر آئی ان میں سوانح عمریاں، مضمون نگاری، سفر نامے، تنقید و تاریخ اور ناول کا آغاز ہوا۔ نئی تعلیم نے انسان اور اس کے مسائل سے دلچسپی کو عام کیا اور داستان گوئی کی جگہ اردو میں ناول نگاری نے لے لی۔ سب سے پہلے قصہ کہانی کو ناول میں منتقل کرنے کا سہرا نذیر احمد کے سر ہے انھوں نے اپنے پہلے ناول مراۃ العروس میں اس اسلامی معاشرے کو جو غدر کے بعد تباہ و

برباد ہوا تھا اور اس کی پستی قابل رحم تھی اسے تہذیبی، سیاسی، معاشی و مذہبی اعتبار سے غور وفکر کی دعوت دی اور اپنے ناول کے آغاز میں انھوں نے لکھا۔

> جو آدمی دنیا کے حالات پر غور نہیں کرتا اس سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں ہے اور غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال ہے غور کرنا چاہیے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے زندگی میں مرتے دم تک اس کو کیا کیا باتیں پیش آتی ہیں اور کیونکر اس کے حالات بدلا کرتے ہیں۔۱۳

مولوی نذیر احمد نے اپنی فہم وفراست سے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان جن عصری تقاضوں کو بھلا کر اپنے عہدے سے معزول ہوئے تھے دوبارہ انہی کو اپنا کر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں لہٰذا انھوں نے سیاسی و عصری مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے بہت سے ناول لکھے۔ نذیر احمد نے اپنے عصر کے تمام خدوخال کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے وہ اپنے عصر کے رجحانات کا گہرا شعور رکھتے تھے اسی کی بدولت انھوں نے مسلمان خاندانوں کی نجی زندگی، طرز معاشرت اور مسائل کو اپنے ناولوں کا حصہ بنایا۔ نذیر احمد نے کل سات ناول تحریر کیے جن سے دو ناولوں ایامی اور ابن الوقت میں انھوں نے اپنے عصر کی سیاسی وسماجی حقیقتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایک مبصر کی حیثیت سے اپنے عصر کی تہذیب کو پیش کیا اور اپنے ناولوں کے کرداروں کے ذریعے نئی زندگی کی حقیقتوں کو دریافت کیا۔

''ایامی'' میں نذیر احمد نے سماجی سطح پر برائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اور ہندوستانی معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کو موضوع بنایا۔ جبکہ ''ابن الوقت'' میں مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لیے سرسید کی زندگی کو موضوع بنایا ہے اور اس ناول میں غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچ کر سیاسی واقعات کو ناول میں تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ بقول رشید احمد گوریجہ:

> نذیر احمد شعوری طور پر ایک ایسا ناول تحریر کرنا چاہتے ہیں جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاسی، سماجی، مذہبی حالت کی عمومی تصویر کشی ہو۔ مسلمانانِ ہند کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں جن مصائب سے گزرنا پڑا اسے سننے کے لیے چیتے کا جگر چاہیے۔ نذیر احمد نے اس سیاسی انقلاب کو ابن الوقت کے پلاٹ کے لیے منتخب کیا تو ان کے پیشِ نظر یہ حقیقت موجود تھی کہ آج کے سیاسی واقعات ہی مستقبل میں تاریخ قرار پاتے ہیں بلکہ سیاسی واقعات کی کروٹیں ہی تاریخ کو جنم دیتی ہیں۔۱۴

نذیر احمد کے بعد سرشار، شرر اور مرزا ہادی رسوا کے نام آتے ہیں۔ سرشار نے فسانہ آزاد لکھ کر اودھ کی زوال آمادہ تہذیب سے روشناس کرایا اور اپنے عہد کے جذباتی وفکری رویوں اور ان کے مابین ہونے والی کشمکش کو فسانہ آزاد کا موضوع بنایا اور عبدالحلیم شرر نے بھی سرسید تحریک سے اثر قبول کیا۔ انھوں نے تاریخی ناول لکھ کر اپنے عصر کی تاریخ کو دہرایا اور معاشرتی ناولوں میں اپنے عصر کے مسائل کو بیان کیا۔ اس کے بعد مرزا ہادی رسوا بھی سرسید تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں اپنے عہد کے مسائل کو بیان کرنے کے لیے سائنٹیفک طریقۂ فکر کو اپنایا۔ انھوں نے

اپنے ناولوں خاص طور پر امراؤ جان ادا میں ایک مخصوص عہد کی تہذیب اور معاشرت کو سمیٹا۔ طوائف کے وسیلے سے انھوں نے کوٹھے کے محدود ماحول کے ذریعے ایک ایسی زندگی کا نمونہ پیش کیا جہاں معاشرتی حقیقتوں کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی کڑواہٹ اور دردناکی کے پہلو بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ ناول میں رسوا نے نوابی عہد کے زوال اور ۱۸۵۷ء کے بعد کے لکھنؤ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد علامہ راشد الخیری کا ذکر بھی اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں مشرقی تہذیب کو موضوع بنایا۔ اور گھریلو زندگی کی صورت میں پورے عصر کی تصویر کشی کی۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق انسان میں تبدیلی گھریلو ماحول و خیالات کی بدولت ہی آتی ہے۔ اس دور میں چونکہ اصلاحی و سماجی تربیت کی بہت ضرورت تھی۔ اس لیے ان کے تمام ناولوں پر ہمیں سرسید تحریک کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔

انیسویں صدی کا سورج جب غروب ہوا اور بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ہندوستانی معاشرہ ایک عجیب افراتفری کا شکار ہوا۔ نت نئے قوانین نے غریبوں اور کسانوں مزدوروں کی زندگی کو اجیرن کر دیا۔ مسائل اور مصائب کی ایک نئی راہ کھل گئی۔ اس کے برعکس اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کا رویہ انگریزوں سے دوستانہ تھا اور وہ ہر وقت انگریزوں سے وفاداری کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ جبکہ غریب طبقہ سماجی معاشی اور اقتصادی طور پر بہت بدحالی کا شکار تھا۔ ایسے میں پریم چند ایک حقیقت پسند فنکار بن کر سامنے آئے انھیں اپنے معاشرے کے مسائل کا بھی گہرا ادراک تھا اسی لیے انھوں نے قلم کے ذریعے اردو ادب میں افسانہ نگاری اور ناول نگاری دونوں اصناف میں کلمہ جہاد شروع کیا اور ناول کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اردو دنیا کو ایک مختصر صنف افسانے سے بھی روشناس کروایا۔ ان کے ناول اور افسانے اپنے عہد کے سیاسی سماجی اور معاشی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں ملتی ہیں۔

شاعری میں اقبال اور افسانے اور ناول میں پریم چند نے وطن پرستی کے جذبوں کے ساتھ مزاحمتی رویوں کا آغاز کیا۔ پریم چند کا شعور جب بیدار ہوا اس وقت انسانی زندگی پہلے سے زیادہ مشکلات سے گزر رہی تھی۔ بیسویں صدی کا ہندوستان دو بڑے گروہوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ ایک گروہ کے لیے مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز قابل رشک اور قابل قبول تھی اور دوسرے گروہ کی انتہا پسندی کا یہ عالم تھا کہ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز سے انھیں نفرت تھی۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ بھی سامنے آتا ہے جو نہ مغرب کا شیدائی تھا نہ مشرق سے بے زار تھا۔ وہ عصری تقاضوں سے بہرور تھا اور مشرق و مغرب کے مخلوط تقاضوں کو ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ یہ گروہ جذبہ آزادی کا الم اٹھائے چل رہا تھا۔ فرسودہ نظام اور روایات کہن سے انحراف اور نئی روایت کا دلدادہ تھا۔ پریم چند کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ بقول ڈاکٹر شفیق انجم:

> پریم چند کے زمانے میں تیزی سے بدلتے حالات میں ان کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس وقت ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم کے افراد اپنے مرکز سے جڑنے اور اپنی شناختوں کی بقا کے لیے مصروف عمل تھے۔ ان حالات میں پریم چند کے ہاں ہندو سماج سے جڑنے کا عمل جہاں ان کی عصری آگہی کی علامت ہے وہاں اپنے عہد کے مجموعی رویوں کا استعارہ بھی ہے۔۱۵

ہندوستان میں بیسویں صدی کے آغاز سے ۱۹۳۱ء تک سیاسی و اقتصادی حالات انتہائی دگرگوں رہے تھے۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں گورنر یوپی نے ہندی کو عدالتی زبان بنا دیا جس سے مسلمانوں کو شدید دھچکا لگا۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں صوبہ بنگال کی تقسیم عمل میں آئی جس پر ہندوؤں کی طرف سے شدید ردعمل کا اظہار ہوا۔ تقسیم کا فیصلہ اگرچہ انگریزوں نے حکومت کے انتظام سنبھالنے کی غرض سے کیا تھا لیکن اس کا براہ راست فائدہ مسلمانوں کو تھا اور ہندوؤں کو مسلمانوں کا فائدہ کسی حال میں منظور نہ تھا چنانچہ انھوں نے اس تقسیم کے خلاف تحریک چلائی اور جلد ہی تنسیخ بنگال ۱۹۱۱ء عمل میں آیا۔ ہندوؤں کے اس سخت مخالفانہ رویے نے ہندو مسلم نفاق کو حتمی شکل دے دیا اور کانگرس کی جانبدارانہ پالیسی بھی اس تحریک میں کھل کر سامنے آئی جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنی ایک الگ سیاسی جماعت مسلم لیگ کے نام سے ۱۹۰۶ء میں بنائی۔ مسلم لیگ کے قیام سے ہندوستان میں مسلم سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اس سیاسی سفر کے دوران ہندوستان مختلف حالات سے گزرتا رہا۔ اس میں عدم تعاون کی تحریک، تحریک خلافت، دہشت پسند نوجوانوں کی انقلابی تحریک، انگریزوں کی فرعونیت، ہندوستان کے جارحانہ تسلط، بھوک اور جہالت نے ہندوستانیوں کی رگوں میں زہر بھر دیا تھا اور جدوجہد آزادی انقلابی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ادیب اور غیر ادیب سب ہی کے دلوں میں غلامی اور بیرونی سامراج کے خلاف نفرت کے جذبات رونما ہوئے جن کے اثرات ادب پر بھی پڑے۔ جس سے ایک نئی تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اس دوران پریم چند نے جو ناول تحریر کیے ان میں میدان عمل، گئودان، بازار حسن، نرملا اور گوشہ عافیت شامل ہیں۔ پریم چند نے اپنے ناولوں میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی موضوعات کو پیش کیا۔ ان کے ناول میدان عمل اور گئودان دونوں سیاسی پس منظر میں تخلیق ہوئے۔ جن میں متوسط طبقے کے کسان، مزدور اور نوجوان آزادی کی تحریکوں اور جدوجہد میں شامل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سنگین حالات کو بے نقاب کیا اور سچے محبّ وطن ہوتے ہوئے ادب کو ملکی و قومی اصلاح کا وسیلہ بنایا۔ بقول ڈاکٹر خالد اشرف:

> ان کے ناولوں اور افسانوں میں غلامی اور استحصال کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہندوستان کی حقیقی اور سچی تصاویر ملتی ہیں۔ ذہنوں میں ظلم کے خلاف متحد ہونے کے خواب کو پالتے ہوئے کسان جو اب مہاجن زمیندار گٹھ جوڑ کے ہاتھوں مزید لینے کو تیار نہیں تھے ..... پنڈت اور مہنت جو مذہب کو اپنے مفاد عیش و آرام کے لیے استعمال کرتے ہیں اور غریب کمزور عوام کو اپنے جال میں پھنسائے رکھنے کے لیے مقامی زمینداروں اور پولیس افسروں کے ساتھ مل کر اپنے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل پر پریم چند کے ناولوں میں پہلی بار پوری شدت اور تفصیل کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ۱۶

ناول نگاری کے ساتھ ساتھ پریم چند نے عصری تقاضوں کے مطابق افسانہ نگاری کا بھی آغاز کیا اور اس طرح ادب کا رخ ناول نگاری کے ساتھ ساتھ مختصر کہانی یعنی افسانے کی طرف مڑ گیا۔ اور افسانے نے عصری آگہی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور ہر رخ سے زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کو اپنا شعار بنا لیا۔

حوالہ جات

۱۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر، پنجاب سندھ اور سرحد کی غزل کا موضوعاتی تقابل (قیام پاکستان کے بعد)، مشمولہ ''دریافت''، اسلام آباد، شمارہ ۸، ص ۲۱۱

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، ادب عصری آگہی اور انشائیہ، مشمولہ ادبی زاویے، کل پاکستان اہل قلم کانفرنس، ۱۹۸۳ء کے مقالات کا مجموعہ اکادمی ادبیات، پاکستان اسلام آباد، ص ۱۱۹

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادب اور عصری آگہی (خطبہ صدارت)، مشمولہ ادبی زاویے، ایضاً، ص ۹۸

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار (تنقیدی مطالعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱

۵۔ شہزاد منظر، ادب میں انتہا پسند رجحانات، ماہنامہ فنون، لاہور، نومبر دسمبر، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ادب میں عصریت کا مفہوم (بحث)، مشمولہ ذہن جدید، سہ ماہی، مارچ اپریل مئی ۱۹۹۱ء، جمشید جہاں ایڈیٹر پبلی کیشنز، دہلی، بھارت، ص ۵۰

۷۔ فضیل جعفری، ادب میں عصریت کا مفہوم، مشمولہ ذہن جدید، ایضاً، ص ۷۱

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، ادب عصری آگہی اور انشائیہ، ایضاً، ص ۱۱۹۔۱۲۰

۹۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان کا فنی تجزیہ، مشمولہ، سرسیدین، پاکستانی ادب، (جلد ۵)، ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی راولپنڈی، ۱۹۸۲ء، ص ۹۰۷

۱۰۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۴۶

۱۱۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ و تنقید، لاہور اکیڈمی ۲۰۵، سرکلر روڈ لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۲۰۲

۱۲۔ حسن ریاض سید، پاکستان ناگزیر تھا، کراچی شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی ۱۹۸۷ء، ص ۲۳

۱۲۔ نذیر احمد، مولوی، مراۃ العروس، بحوالہ مراۃ العروس کا تجزیاتی مطالعہ، از ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۵

۱۳۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو ناول میں تاریخی ناول نگاری، گنج شکر پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۲۔۱۴۳

۱۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۲

۱۵۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۔۱۹